ہمارے ائمہ اور سیاسی جدوجہد

آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی

ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی صاحب

ائمہ علیہم السلام کی مظلومیت ان بزرگان اسلام کی زندگیوں تک محدود نہیں رہی، بلکہ آج سیکڑوں سال گزر جانے کے باوجود ان حضرات کی سیرت کا ایک اہم ترین بلکہ اصلی ترین رخ لوگوں کی عدم توجہی کا شکار ہے جس نے ائمہ کی مظلومیت کو تاریخی استمرار عطا کر دیا ہے۔ یقیناً گذشتہ صدیوں میں بڑی ہی بے مثال اور قیمتی کتابیں اور مقالے اس موضوع پر لکھے گئے ہیں کیونکہ ان پاک اور بزرگ ہستیوں کی زندگیوں سے متعلق تمام روایات مختلف مجموعوں کی شکل میں آیندہ آنے والی نسلوں کے لئے جمع کر دینا ایک بڑا کارنامہ ہے پھر بھی ''سیاسی جدوجہد کے نقوش'' جو ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی تقریباً دوسو پچاس سال کی ظاہری زندگی کے اہم ترین اور ممتاز ترین پہلو ہیں، ان بے شمار احادیث و روایات اور ان کے علمی و معنوی پہلوؤں کو اجاگر کرنے والی سوانح حیات میں تقریباً گم سے ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہمیں ائمہ علیہم السلام کی زندگی، درس اور اسوہ کے عنوان سے ہمہ وقت یاد رکھنی چاہیے نہ کہ اس کا ہم صرف ایک شاندار قابل فخر یادگار کے عنوان سے وقتاً فوقتاً ذکر کر لیا کریں اور بس۔ چنانچہ یہ چیز اسی وقت ممکن ہے جب ہم ان عظیم ہستیوں کی سیاسی روش اور ان کے طریقہ کار پر بھی توجہ دیں۔

جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے مجھے ائمہ علیہم السلام کی زندگی کے اس رخ نے خاص طور پر متاثر کیا ہے اور میں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ میرے ذہن میں یہ خیال ۱۹۷۱ء ان سخت ترین امتحانی ایام میں پیدا ہوا۔ اگر چہ اس سے قبل بھی ائمہ معصومینؑ کی زندگی کے اس رخ سے غافل نہیں تھا اور اعلائے کلمۂ توحید و استقرار حکومت الٰہی کے سلسلہ میں ان عظیم مجاہدوں کی قربانی و فداکاری میرے پیش نظر تھی پھر بھی وہ نکتہ جو اس گھڑی ناگہانی طور پر میرے ذہن میں روشن ہوا یہ تھا کہ ان بزرگواروں کی زندگی ـــــ اس ظاہری تفاوت کے باوجود جس کو دیکھ کر بعض لوگوں نے تناقض کردار کا گمان کیا ہے ـــــ دراصل مجموعی طور پر ایک مسلسل اور طولانی تحریک ہے جو ۱۱ھ سے شروع ہوئی ہے اور دوسو پچاس سال تک مسلسل جاری رہ کر ۲۶۰ھ میں غیبت کبریٰ کی ابتداء کے ساتھ منتہی ہو جاتی ہے یہ تمام ہستیاں مل کر ایک واحد کردار و شخصیت ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ ان سب کا راستہ اور مقصد ایک ہی ہے لہٰذا ہم بجائے اس کے کہ زندگی امام حسن مجتبیٰؑ کا الگ اور زندگی سید الشھداءؑ کا الگ اور زندگی سید سجادؑ کا الگ جداگانہ طور پر جائزہ لیں اور پھر احیاناً اس خطرناک اشتباہ اور دام میں گرفتار ہو جائیں کہ ان تینوں ائمہؑ کی زندگیوں میں

بظاہر فرق ان کے درمیان اختلاف وتعارض کی نشاندہی کرتا ہے، ہم ان سب کی زندگی کو ملا کر ایک ایسے انسان کی زندگی فرض کریں جس نے دوسو پچاس سال کی عمر پائی ہو اور ۱۱ھ سے لیکر ۲۶۰ھ تک ایک ہی راہ پر مسلسل طور پر گامزن رہا ہو اس طرح اس عظیم اور معصوم زندگی کا ایک عمل قابل فہم اور لائق توجیہ ہو جائے گا۔

ہر وہ انسان جو عقل وحکمت سے مالا مال ہوگا، چاہے وہ معصوم نہ بھی ہو، جب وہ اتنی طویل مدت طے کرے گا تو حتمی طور پر وقت اور حالات کے تحت مناسب حکمت عملی اختیار کرے گا۔ ممکن ہے وہ کبھی تیزی کے ساتھ حرکت کرنا ضروری سمجھے اور کبھی سست رفتاری میں مصلحت سمجھے حتیٰ ممکن ہے کبھی وہ کسی حکیمانہ تقاضے کے تحت پسپائی بھی اختیار کرلے۔ تو ظاہر ہے وہ لوگ جو اس کے علم وحکمت اور ہدف ومقصد سے دوستی کا علم رکھتے ہیں اس کی عقب نشینی کو بھی پیش قدمی شمار کریں گے۔ اس نقطۂ نظر سے امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام کی زندگی امام حسن مجتبیٰؑ کی زندگی کے ساتھ اور آپ کی زندگی سید الشہداء امام حسینؑ کی زندگی کے ساتھ اور حضرت کی زندگی دیگر آٹھ ائمہ کی زندگیوں کے ساتھ ۲۶۰ھ تک ایک مسلسل تحریک کہی جاسکتی ہے۔

یہ وہ خیال تھا جس کی طرف میں اس وقت متوجہ ہوا اور پھر اسی نقطۂ نظر سے میں نے ان عظیم ہستیوں کی زندگیوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور جیسے جیسے میں آگے بڑھتا رہا میری اس فکر کو تائید حاصل ہوتی گئی۔

اگر چہ اس موضوع پر کوئی تفصیلی بحث کرنا ایک نشست میں ممکن نہیں ہے لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ پیغمبر اسلام کی ذریت طاہرہ یعنی ائمہ معصومینؑ کی پوری زندگی ایک خاص سیاسی موقف کے ہمراہ رہی ہے لہٰذا یہ اس قابل ہے کہ اس کو جداگانہ طور پر مستقل عنوان کی حیثیت سے مورد بحث قرار دیا جائے۔ لہٰذا میں مختصر طور پر یہاں اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

پہلی چیز یہ عرض کرنا ہے کہ ائمہ کی فیصلہ کن سیاسی جدوجہد سے ہماری مراد کیا ہے؟

میری نظر میں ائمہ کی مجاہدانہ کوششوں کو محض علمی، اعتقادی اور کلامی مبارزہ کا نام دینا درست نہیں ہے جس طرح کی کلامی تحریکوں کی مثالیں تاریخ اسلام میں ملتی ہیں جیسے معتزلہ واشاعرہ وغیرہ کی تحریکیں، علمی نشستوں میں ائمہ کی شرکت، حلقۂ درس کی وسعت، بیان حدیث ونقل معارف اسلامی اور احکام فقہی کی تشریح وتوضیح وغیرہ فقط اسی لئے نہیں تھی کہ علم فقہ یا علم کلام سے متعلق اپنے مکتب فکر کی حقانیت ثابت کردی جائے بلکہ ان سے کہیں زیادہ اہم مقاصد مضمر تھے۔

اسی طرح اس کو اس نوعیت کا مسلحانہ قیام کہنا بھی درست نہیں ہے جیسا کہ جناب زید شہید اور ان کے بعد ان کے ورثہ یا بنی الحسنؑ اور بعض آل جعفرؑ نیز اسی قبیل کے دوسرے افراد کے یہاں ائمہ علیہم السلام کی حیات کے دوران نظر آتا ہے۔ ان حضراتؑ نے ایسا کوئی مبارزہ نہیں کیا البتہ اسی مقام پر یہ اشارہ کردینا ضروری ہے کہ ائمہ معصومینؑ نے بطور مطلق ان تمام قیام کرنے والوں کی مخالفت بھی نہیں کی

اگر چہ بعض کی مخالفت بھی کی ہے۔لیکن اس کا سبب مسلحانہ قیام نہیں تھا بلکہ کچھ دوسری وجوہات بھی تھیں۔بعض کی بھرپور تائید بھی کی ہے بلکہ بعض کی مختلف عنوان سے پشت پناہی اور مدد بھی کی ہے۔اس سلسلہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث قابل توجہ ہے آپ فرماتے ہیں:-

لو ددت ان الخارجی یخرج من آل محمد و علیٰ نفقۃ عیالہ۔

مجھے یہ پسند ہے کہ کوئی آل محمدؐ و علیؑ میں سے خروج کرے اور اس کے اہل و عیال کے اخراجات کا میں ذمہ دار بنوں۔(اس میں مالی امداد، آبرو کی حفاظت، مخفی جائے تحفظ مہیا کرنا یا اسی طرح کی دوسری مدد بھی شامل ہے) لیکن بہ نفس نفیس خود امام وقت کی حیثیت سے جہاں تک میری نگاہ ہے اس طرح کے موقع پر ان حضرات نے مسلحانہ قیام میں کبھی شرکت نہیں کی۔

چنانچہ ائمہ علیہم السلام کی سیاسی جدو جہد سے مراد نہ تو وہ پہلی علمی مبارزہ کی صورت ہے اور نہ ہی اس دوسری نوعیت کا مسلحانہ قیام بلکہ اس سے مراد وہ مبارزہ ہے جو ایک سیاسی ہدف اور مقصد کے تحت ہمیشہ ائمہ علیہم السلام کی زندگی میں نظر آتا ہے۔اور وہ سیاسی مقصد ''ایک اسلامی حکومت کی تشکیل ہے'' جس کو ہم اپنی زبان میں حکومت علوی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ ۲۶۰ھ تک مسلسل طور پر ائمہ کی یہی کوشش رہی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ایک الٰہی حکومت قائم کریں اور یہی اصل مدعا ہے البتہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خود اپنے ہی دور میں (یعنی ہر امام اپنے اپنے دور میں) اسلامی حکومت قائم کر دینا چاہتا تھا ممکن ہے یہ جدو جہد مستقبل قریب، مستقبل بعید حتی کہ بعض حالات میں نزدیک ترین مدت سے متعلق رہی ہو مثلاً امام حسن مجتبیٰؑ کے دور میں کی جانے والی کوششیں آئندہ کم سے کم مدت میں اسلامی حکومت کے قیام کی طرف اشارہ کرتی ہیں چنانچہ مسیب ابن نجبہ اور اسی قبیل کے دوسرے افراد نے جب امام علیہ السلام سے سوال کیا کہ: آپ نے کیوں سکوت اختیار کر لیا؟ تو ان کے جواب میں امامؑ نے جو جملہ ارشاد فرمایا ہے وہ اسی کی طرف اشارہ ہے امامؑ فرماتے ہیں:-

''ماندری لعلہ فتنۃ لکم و متاع الیٰ حین''

جناب سید سجادؑ کے دور میں یہ کوششیں میری نظر میں مستقبل قریب کے لئے تھیں جس کے لئے ثبوت و شواہد موجود ہیں جو آئندہ پیش کئے جائیں گے۔امام محمد باقر علیہ السلام کے دور میں غالباً نزدیک ترین مستقبل میں اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش جاری رہی البتہ امام ہشتم کی شہادت کے بعد کی جانے والی کوششوں کے سلسلہ میں گمان اس بات کا ہے کہ مستقبل بعید کے لئے رہی ہوں۔مختصر یہ کہ یہ حکومت کب قائم ہو اس اعتبار سے جدو جہد کا طریقۂ کار مختلف ہو سکتا ہے لیکن یہ طے ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لئے کوششیں ہمیشہ جاری رہی ہیں۔

ائمہ علیہم السلام کی سوائے ان روحی و معنوی امور کے جو ایک بندہ اپنے خدا سے قربت اور عرفانی مراحل کی

تکمیل کے سلسلہ میں انجام دیتا ہے ہر طرح کی سرگرمی، درس و تدریس، حدیث و علم کلام کی موشگافیاں، مخالفین سے علمی و سیاسی مناظرے، مختلف گروہوں کی حمایت یا مخالفت وغیرہ سب کچھ اسی مقصد کے لئے تھی کہ ایک اسلامی حکومت قائم کی جاسکے۔ یہ ہمارا دعویٰ ہے۔

البتہ اس موضوع پر لوگوں کے درمیان اختلاف نظر رہا ہے اور رہے گا اور مجھے بھی قطعی اس پر اصرار نہیں ہے کہ ہر شخص میری فکر اور نظریہ کو آنکھ بند کر کے قبول کر لے بلکہ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ بحث کا یہ سرا پوری توجہ اور دقت کے ساتھ مورد نظر قرار دیا جائے اور ائمہ کی زندگی پر اس زاویہ سے تجدید نظر ضرور کی جائے۔ ادھر چند برسوں میں میری تحقیق و جستجو اس محور پر رہی ہے کہ یہ خیال کس حد تک مجموعی طور پر تمام ائمہ علیہم السلام کے بارے میں اور کس حد تک فرداً فرداً ان حضرات کے سلسلہ میں محکم دلائل کے تحت صادق آتا ہے؟ چنانچہ اس سلسلہ کی بعض دلیلیں کلی نوعیت کی ہیں، مثال کے طور پر:-

ہمیں معلوم ہے کہ امامت، سلسلہ نبوت کی ہی ایک تکمیلی کڑی ہے اور نبیؐ کا از اول امام ہونا ثابت ہے جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس قول سے بھی ظاہر ہے **ان رسول اللہ کان ھو الامام**......اور رسول اللہ صلعم نے حق وعدالت پر مبنی ایک الٰہی نظام قائم کرنے کے لیے ہی قیام فرمایا تھا اور ایک عرصہ تک اپنی انتھک جدوجہد کے بعد اس طرح کا نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو بھی ہو گئے تھے جس کی تاحیات آپؐ حفاظت بھی کرتے رہے۔ لہٰذا امام جو جانشین نبی ہے، ایک ایسے نظام سے ہرگز غفلت اختیار نہیں کرسکتا۔ یہ استدلال کی ایک کلی صورت ہے البتہ اس ذیل میں بحث و گفتگو اور مختلف نکات پر غور و خوض کے ذریعہ تحقیق کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ ہماری بعض دلیلیں جو خود ائمہ علیہم السلام کے ان کلمات سے ماخوذ ہیں جو انہوں نے بطور دلیل کے صادر فرمائے ہیں یا ان کے اس طریقۂ زندگی سے مستفاد ہیں جو اس نکتہ کی طرف متوجہ رہنے اور اس اعلیٰ مقصد کو ذہن میں رکھنے کے بعد اپنے اندر معنی پیدا کر لیتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہم اپنے آپ کو اس زمانہ کی وضعیت اور ماحول میں پہونچا کر حالات کا جائزہ لیں تو اس صورت حال کے سمجھنے میں ضرور کسی حد تک مدد مل سکتی ہے جس سے ائمہ نبرد آزما تھے یعنی اگر ہم خود اپنے آپ کو انکی جگہ پر محسوس کریں تو بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ جیسا کہ اس زمانہ (شاہ) میں ہمارے لئے یہ کیفیت حاصل تھی، تاریک و متعفن قید خانے میں پہنچ کر ایک انسان: ''**السلام علی المعذب فی قعر السجون و ظلم المطامیر ذی الساق المرضوض بحلق القیود**'' جیسے جملے کا مفہوم اور علت و وجہ صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے۔ بہر حال اسی نقطۂ نظر کو مرکز بحث قرار دیتے ہوئے اپنے افکار و خیالات آپ کے سامنے پیش کر دینا چاہتا ہوں۔

جو افراد دوسری صدی ہجری کی سیاسی تاریخ پر بھر پور نظر رکھتے ہیں اور جنہوں نے ۱۰۰ھ سے کچھ قبل سے لیکر ۱۳۲ھ یعنی بنو عباس کے آغاز حکومت تک بنی عباس کی سرگرمیوں کا مطالعہ کیا ہے کسی حد تک ائمہ علیہم السلام کی بھرپور

سیاسی جد و جہد کو اس وقت کی بنی عباس کی سیاسی زندگی سے شبیہ دے سکتے ہیں لیکن جس نے بنوعباس کی زندگی ان کی سیاسی جد و جہد اور ان کی دعوتوں کا قاعدہ سے مطالعہ نہیں کیا ہے اس کے لئے ہرگز یہ شبیہ قابل فہم ورسا نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح کے حالات ائمہؑ کی زندگی میں بھی نظر آتے ہیں بس فرق جوہر کا ہے جو ائمہ کے مقصد اور بنی عباس کے مقصد، ائمہ کی روش اور بنی عباس کی روش، ائمہ کی شخصیت اور بنی عباس کی شخصیت کے درمیان پایا جاتا ہے البتہ شکل ونقشہ کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے بہت نزدیک نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض موارد میں یہ دونوں راہیں ایک دوسرے میں مخلوط و مدغم نظر آتی ہیں یعنی بنوعباس آل علیؑ کے ساتھ اپنے طریقہ کار، تبلیغات اور نعرہ و دعوت کی یکسانیت وقربت کی وجہ سے عراق وحجاز سے دور علاقوں میں ایسا ظاہر کرتے تھے کہ گویا وہ آل علیؑ کی راہ پر ہی کاربند ہیں حتی کہ مسودہ نے بنوعباس کی طرف دعوت آغاز کے وقت جب خراسان ورے میں سیاہ لباس پہنے تو نعرہ لگایا: **هٰذا السواد، حداد آل محمد و شهداء كربلا و زيد و يحیٰ**۔ یعنی یہ سیاہ لباس شہدائے کربلا اور زید ویحیٰ کے ماتم کی علامت ہے۔ چنانچہ یہاں کے بعض رہنے والے حتی کہ سرداران قبیلہ بھی ان سیاہ پوشوں کے بارے میں یہی خیال کرتے تھے کہ یہ لوگ آل علیؑ کے لئے کام کررہے ہیں۔

کچھ ایسی ہی صورت حال ائمہ علیہم السلام کی حیات طیبہ میں بھی نظر آتی ہے البتہ جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں، تین بنیادی عنصر ـــــ مقصد، روش اور اشخاص کے فرق کے ساتھ ہے۔ ائمہ کی زندگی میں سیاسی جد و جہد کا یہی مطلب ہے۔

ائمہ کی سیاسی تحریک کی کلی تصویر

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ کے سیاسی جہاد اور جد و جہد کی کلی طور پر تصویر کشی کردی جائے اس کے بعد ائمہ کی زندگی سے ان کی سیاسی جد وجہد کے چند روشن نمونے بھی پیش کئے جائیں گے۔

اس کلی تصویر کشی کے سلسلہ میں پہلے تین ائمہ یعنی امیر المومنینؑ، حسن مجتبیٰؑ اور سید الشہداء علیہم السلام کی زندگیوں کو فی الحال ہم مورد بحث قرار دینا نہیں چاہتے کیونکہ ان کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ ان کا سیاسی تحریک سے وابستہ ہونا کسی سے مخفی نہیں ہے چنانچہ ہم اپنی بحث جناب سید سجاد علیہ السلام سے شروع کرتے ہیں۔

میری نظر میں امام زین العابدین علیہ السلام کے دور یعنی ۶۱ھ سے لیکر ۲۶۰ھ تک دوسو سال کا عرصہ تین سیاسی سرحدوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا مرحلہ ۶۱ھ سے ۱۳۵ھ یعنی منصور عباسی کی ابتدائے خلافت تک پھیلا ہوا ہے اس مرحلہ میں سیاسی جد و جہد ایک نقطہ سے شروع ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ اس میں ایک کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے پھر گہرائی حاصل کرکے پھیلنا شروع ہوتی ہے اور پورے اوج پر آجاتی ہے یہاں تک کہ ۱۳۵ھ میں سفاح کی موت اور منصور دوانقی کی خلافت کے ساتھ یہ ایک نئے موڑ سے دوچار ہوتی ہے ایسی مشکلات سامنے آتی ہیں کہ بڑی حد تک اس کی ترقی میں ٹھراؤ پیدا

ہوتا نظر آنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے سیاسی تحریکوں میں اس طرح کی صورت اکثر پیش آتی رہتی ہے۔ خود اسلامی انقلاب ایران کے سلسلہ میں ہم ایسی کیفیات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔

دوسرا مرحلہ ۱۳۵ھ سے ۲۰۲ھ یا ۲۰۳ھ تک کا ہے جو شہادت امام رضا علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ یہ دور پہلے دور کی بہ نسبت جد و جہد کے اعتبار سے بالاتر عمیق تر اور وسیع تر نظر آتا ہے اگر چہ اس دور کا آغاز سخت مشکلات کے ہمراہ ہوا تھا پھر بھی اس نے رفتہ رفتہ اوج حاصل کر لیا، پھیلا اور قدم بہ قدم کامیابیوں سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ امام ہشتم حضرت علی رضا علیہ السلام کی شہادت کے بعد اس جد و جہد میں پھر توقف پیدا ہو گیا۔

تیسرا مرحلہ ۲۰۴ھ میں مامون رشید کے بغداد چلے جانے کے بعد اسلامی جد و جہد کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے دراصل مامون کی خلافت کے ابتدائی دن ائمہ علیہم السلام کی زندگی کے نہایت ہی دشوار اور محنت و تعب کے دن ہیں اگر چہ اس دور میں ہمیشہ سے زیادہ تشیع پھیلا، میری نظر میں اس عصر میں ائمہ علیہم السلام کو مصائب و آلام کا مقابلہ ہمیشہ سے زیادہ کرنا پڑا ہے اور یہ وہی زمانہ ہے جب میرے خیال میں، اس سیاسی جد و جہد کا رخ مستقبل بعید کے ہدف کی طرف پھر چکا تھا۔ یعنی اب ائمہؑ کو غیبت صغریٰ سے قبل الٰہی حکومت کے قیام کی امید نہیں رہ گئی تھی ان کی کوششیں مستقبل بعید کے لئے زمین ہموار کرنے کی طرف منتقل ہو چکی تھیں اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ۲۶۰ھ میں امام حسن عسکریؑ کی شہادت اور غیبت صغریٰ کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ یہ تینوں ادوار کچھ امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں جنہیں اجمالی طور پر بیان کروں گا۔

پہلا دور:- یہ دور سید سجادؑ، امام باقرؑ اور صادق اہلبیت طہارتؑ کی زندگی کے ایک حصے پر مشتمل ہے چنانچہ اس کا آغاز بے پناہ دشواریوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ کربلا کے حادثہ نے دنیائے شیعیت بلکہ پورے عالم اسلام کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور قتل و قید و شکنجہ و ظلم کوئی نئی بات نہ تھی لیکن خاندان نبوت کی شہادت اور پھر مخدرات عصمت و طہارت کی اسیری ان کی شہر بہ شہر تشہیر، فرزندان زہراؑ کے سرہائے بریدہ کا نیزوں پر بلند کیا جانا جبکہ ابھی وہ لوگ موجود تھے جنہوں نے ان لبہائے مبارک کو پیغمبرؐ اسلام کا بوسہ دینا خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ چیزیں تھیں جس نے پورے جہان اسلام کو کو مبہوت و متحیر کر دیا تھا کسی کے تصور میں بھی نہ تھا کہ حالات یہ رخ اختیار کر لیں گے! اگر یہ شعر جو جناب زینب سلام اللہ علیہا کی طرف منسوب ہے درست ہو کہ ؎

ماتوھمّت یاشقیق فؤادی کان ھذا مقدّراً مکتوبا

دراصل اسی ناقابل تصور درد و کرب کا اظہار ہے اور یہی احساسات تمام لوگوں کے تھے۔ یکا یک ذہنوں میں یہ تصور پیدا ہونے لگا کہ موجودہ سیاست ایک دوسری قسم کی سیاست ہے یہ ظلم و زیادتی اب تک ہونے والی زیادتیوں سے کہیں زیادہ تھی۔ ناقابل تصور چیزوں نے عملی جامہ پہن لیا اور انجام دی گئیں چنانچہ تمام دنیائے اسلام پر ایک عجیب قسم کی دہشت اور رعب کا عالم طاری تھا صرف کوفہ میں توابین اور پھر مختار کی برکت سے کچھ فضا متحرک ہوتی نظر آئی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ

مدینۂ منورہ نیز دیگر مقامات پر واقعۂ کربلا کے اثر سے ایسا شدید قسم کا رعب مسلط تھا حتیٰ کہ مکۂ معظّمہ میں بھی جہاں کچھ دنوں بعد عبداللہ ابن زبیر نے آواز اٹھائی ایسی کیفیت طاری تھی کہ تاریخ اسلام میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ کوفہ میں بھی اگرچہ ۶۴ھ، ۶۵ھ ہجری میں (کیونکہ بظاہر توابین کو ۶۵ھ میں شہید کیا گیا) توابین کی کوششوں سے وہاں کی مرگ بار بوجھل فضا میں ایک تازہ لہر پیدا ہوئی لیکن دوبارہ توابین کی شہادت نے اس خوف و وحشت میں اور اضافہ کر دیا اور پھر جب اموی کارخانۂ سیاست کے دشمن یعنی مختار اور مصعب ابن زبیر آپس میں لڑ پڑے اور عبداللہ ابن زبیر کو مکہ میں رہ کر بھی اہلبیتؑ کے طرفدار جناب مختار کا وجود کوفہ میں برداشت نہ ہوسکا اور مصعب ابن زبیر کے ہاتھوں مختار قتل کر دیئے گئے اس سے خوف و وحشت میں مزید اضافہ ہوا اور امیدیں، مایوسی سے بدلنے لگیں اور آخر کار جیسے ہی عبد الملک ابن مروان کو تخت بنوامیہ پر تسلط حاصل ہوا تھوڑے ہی عرصہ میں پوری دنیائے اسلام پر بنوامیہ کی گرفت مضبوط ہوگئی اور اکیس سال تک پورے قدرت و اقتدار کے ساتھ وہ مسلمانوں کی تقدیر کے ساتھ کھیلتا رہا۔

واقعہ حرہ:- اس مقام پر خاص طور پر واقعہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ۶۴ھ میں جس سال مدینۂ رسولؐ پر مسلم بن عقبہ نے چڑھائی کی ہے یہ واقعہ رونما ہوا جو مزید رعب و وحشت پیدا کرنے کا سبب قرار پایا اور جس نے اہلبیتؑ کو مکمل طور پر غربت و مظلومیت میں مبتلا کر دیا۔ اس حادثہ کی حقیقت مختصر طور پر یہ ہے کہ ۶۲ھ میں یزید نے شامی سرداروں میں سے ایک ناتجربہ کار جوان کو نمایندہ بنا کر مدینہ روانہ کیا جس نے اہل مدینہ کے خیالات یزید کی طرف سے صاف کرنے کیلئے چند افراد کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ شام جا کر یزید سے ملاقات کریں چنانچہ کچھ لوگ اس پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے شام جا کر یزید سے ملاقات بھی کی اگر چہ یزید نے ان کو بہت زیادہ انعامات (تقریباً پچاس ہزار سے ایک لاکھ درہم تک) سے نوازا لیکن یہ لوگ جو خود صحابہ میں سے یا اولاد صحابہ میں سے تھے یزیدی دربار کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد اور زیادہ متنفر اور خشمگین ہو گئے اور جب مدینہ واپس ہوئے تو عبداللہ ابن حنظلہ غسیل الملائکہ نے اپنی حکومت کا اعلان کر کے یزید کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا مرکزی حکومت سے مدینہ کا رابطہ منقطع کر لیا گیا۔ یزید نے بھی مسلم ابن عقبہ کو ان کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا اور مدینۂ رسول میں ایسا عظیم المیہ برپا ہوا جس نے تاریخ میں خون کے آنسو رلا دینے والے سسکیوں اور آہوں سے معمور باب کا اضافہ کر دیا۔

یہ واقعہ بھی لوگوں میں شدید رعب و وحشت ایجاد کرنے کا سبب بنا۔

فکری انحطاط:- اس خوف و ہراس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ دوسرے عوامل بھی کارفرما تھے جس نے لوگوں کو دین کی طرف سے بے اعتنا اور لاپرواہ بنا رکھا تھا گذشتہ بیس برسوں کے دوران پورے عالم اسلام میں ایک عجیب فکری انحطاط پیدا ہو چکا تھا جس کے نتیجہ میں دینی تعلیمات کو لوگوں نے یکسر فراموش کر دیا تھا۔ گویا ۴۰ھ کے بعد تقریباً بیس

سال کے عرصہ میں دین وایمان کی تعلیم، آیات الٰہی کی تفسیر اور پیغمبرؐ اسلام کے حق وآگہی سے بھرپور بیانات اس حد تک محدود ہوکر رہ گئے تھے کہ عوام الناس اعتبار وایمان کے لحاظ سے بالکل فرومایہ، کھوکھلے اور دیوالیہ ہو چکے تھے۔ جب ایک انسان اس دور کی عوامی زندگی کا ذرا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیتا ہے اور مختلف تاریخوں اور روایتوں میں ان کے حالات کھنگالنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقتیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلامی معاشرہ میں علماء وقارئین اور محدثین ومقدسین بالکل ناپید ہو چکے تھے (ان کے بارے میں بھی گفتگو بعد میں آئے گی) پھر بھی عوامی زندگی بلاشبہ بے ایمانی و بے اعتقادی کا شکار تھی حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ خود دربار خلافت سے تعلق رکھنے والے افراد نبوت کو بھی زیر سوال قرار دینے لگے تھے۔ چنانچہ کتابوں میں مذکور ہے کہ خالد بن عبداللہ قسری، جس کو بنوامیہ کی پستی و رذالت کا بدترین نمونہ کہا جاسکتا ہے، بڑی ہی دیدہ دلیری کے ساتھ کہتا ہے:- ''کان یفضل الخلافۃ علی النبوۃ'' (معاذ اللہ) خلافت نبوت سے بالاتر ہے!! اور اس کے لئے دلیل کے طور پر کہتا تھا کہ ''ایھما افضل؟ خلیفۃ الرجل فی اھلہ او رسولہ الیٰ صحابہ؟'' اگر تم ایک شخص کو اپنا جانشین، اپنے خانوادہ میں مقرر کرتے ہو تو وہ شخص تم سے قریب تر ہوگا یا وہ شخص جس کو کسی کے پاس پیغام رسانی کا ذریعہ بنایا جائے؟ ظاہر ہے جس کو تم اپنے خانوادہ میں منتخب کرکے اپنا جانشین مقرر کرتے ہو وہی تم سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ لہٰذا خلیفۃ اللہ (یہ لوگ خلفاء کو خلیفۂ رسول کے بجائے خلیفہ خدا تصور کرنے لگے تھے) رسول اللہ سے بالاتر ہے۔

یہ تو خالد بن عبداللہ قسری کی بات تھی یقینا اس طرح کی باتیں دوسرے افراد بھی کرتے رہے ہوں گے جب میں نے بنوامیہ اور بنوعباس کے دور کے شعراء کے یہاں تلاش کرنا شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ سے خلفاء کے لئے خلیفۃ اللہ کی تعبیر اس کثرت سے استعمال کی جانے لگی کہ عوام یہ بھی بھول گئے کہ خلیفہ، خلیفۂ پیغمبر بھی ہوتا ہے یہ سلسلہ بنوعباس کے دور میں بھی جاری رہا چنانچہ بشار ابن برد نے جب یعقوب ابن داؤد اور منصور کی ہجو لکھی تو اس میں بھی یہی تعبیر استعمال کی:

ضاعت خلافتکم یا قوم فالتمسوا خلیفۃ اللہ بین الزق والعود۔

سوچنے کا مقام ہے جب ایک شاعر ہجو کرتا ہے تو بھی خلیفۃ اللہ کی لفظ استعمال کرتا ہے۔ اس زمانہ کے تمام نامور شعراء جریرؔ، فرزدقؔ، نصیبؔ اور سیکڑوں بڑے مشہور شعراء جب خلیفہ کی مدح سرائی کرتے ہیں تو اس کو خلیفۃ اللہ خطاب کرتے ہیں۔

یہ اس زمانہ کے لوگوں کے اعتقاد کا صرف ایک نمونہ ہے دین کی بنیادی باتوں کے سلسلہ میں بھی اس حد تک ایمان کمزور ہو چکا تھا۔

لوگوں کے اخلاق وعادات تو اس سے بھی زیادہ خراب تھے۔ ابوالفرج کی کتاب اغانی کا مطالعہ کرتے وقت ایک نکتہ یہ میرے ہاتھ آیا کہ تقریباً اسی اور نوے ہجری سے ۵۰، ۶۰ سال بعد تک جتنے بڑے بڑے گانے بجانے

والے عیاش اور عشرت طلب افراد تھے وہ مدینہ سے تعلق رکھتے تھے یا مکہ سے چنانچہ جب شام میں خلیفہ کا دل اکتا جاتا تھا اور محفل رقص وسرود گرم کرنے کی خواہش مچلنے لگتی تھی تو بہترین قسم کے گانے بجانے والوں کے حاضر کئے جانے کا حکم صادر ہوتا تھا اور فوراً کسی کو مکہ یا مدینہ، جو اس وقت مشہور ومعروف گانے بجانے والے مغنیوں اور طبلہ بجانے والوں کا مرکز تھے، روانہ کیا جاتا اور وہ وہاں سے چنیدہ افراد کو ساتھ لے آتا ـــــ بدترین فحاشی اور ہرزہ سرائی کرنے والے شعراء مکہ اور مدینہ میں موجود تھے۔

مرکز وحی والہام اور منبع ایمان واسلام مرکز فحشا و فساد میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہمیں مکہ ومدینہ کے بارے میں ان تلخ حقائق کو بھی جاننا چاہئے۔ افسوس ہے کہ ائمہ کے حالات زندگی سے متعلق کتب وآثار میں ان تلخ حقیقتوں سے چشم پوشی کی گئی ہے۔

مکہ میں ایک عمر ابن ربیعہ نامی شاعر تھا جس کا شمار بدترین عریاں اور فحش نگاروں میں ہوتا تھا۔ البتہ شک نہیں کہ فن شاعری میں اس کو پوری قدرت اور کمال حاصل تھا، اس کی داستان اور اس قسم کے دوسرے شعراء کا کردار ایک نہایت ہی افسوسناک اور شرم انگیز تصویر پیش کرتا ہے خود مقامات طواف طواف ورمی جمرات نیز دیگر مشاہد مقدسہ ان لوگوں کی بیہودہ گوئی اور فسق وفجور کے شاہد ہیں۔ ''مغنی'' میں درج یہ اشعار

بدا الی منها حین جمرّت
وکف خضیب زيّنت ببنان
فوالله ما ادری وان کنت داریا
بسبع رمین الجمر ام بثمان

اسی دور کی وضعیت وکیفیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک راوی کے الفاظ میں جس وقت عمر ابن ربیعہ مرا ہے پورے مدینہ میں صف ماتم بچھ گئی مدینہ کی گلیوں اور کوچوں سے لوگوں کے رونے اور فریاد کرنے کی آوازیں بلند تھیں۔ جس طرف سے گذریئے نوجوانوں کی ٹولی حلقہ بنائے عمر ابن ربیعہ کی موت پر رنج وغم میں بیٹھی نظر آتی تھی۔ میں نے ایک کنیز کو دیکھا کہ کسی کام سے چلی جارہی ہے اور اس حالت میں بھی اس کی آنکھوں سے اشک جاری ہیں گریہ وزاری کرتی ہوئی جب وہ کچھ نوجوانوں کے قریب سے گذری تو انہوں نے سوال کیا : کیوں اس قدر گریہ کر رہی ہو؟ کنیز نے جواب دیا ''اس لئے کہ یہ شخص ہمارے ہاتھ سے چلا گیا'' کسی نے کہا ''غم نہ کرو مکہ میں ایک دوسرا شاعر حارثؔ ابن خالد مخزوی موجود ہے اور وہ بھی عمر ابن ربیعہ کی طرح شعر کہتا ہے'' یہ کہکر اس نے حارثؔ کا ایک شعر سنایا جو جس کو سن کر کنیز نے اپنی آنکھوں سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا ''**الحمد لله الذی لم یخل حرمه** (خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنا حرم خالی نہیں چھوڑا!!)

یہ اہل مدینہ کی اخلاقی کیفیت کا ایک معمولی سا نقشہ تھا۔ اس طرح کی بے شمار داستانیں اور اہالیان مکہ ومدینہ کی شب نشینی کے واقعات کتابوں میں موجود ہیں اور یہ پست طبقہ کے افراد تک محدود نہیں بلکہ ہر طبقہ کا یہی عالم تھا کہ ایک گدائی کرنے والا فاقہ خور وبدبخت شاعر اور جوکر شعب جو 'طماع' (لالچی) کے نام سے مشہور تھا اس سے لیکر کیا کوچہ وبازار میں پھرنے والے معمولی آدمی اور کیا عیش و

عشرت کی زندگی بسر کرنے والے قریشی نواب زادے سبھی یکساں تھے حتیٰ کہ بعض بنی ہاشم جن کا نام میں یہاں نہیں لینا چاہتا ان کی بھی یہی حالت تھی۔ قریش کی مشہور و معروف شخصیتوں کی اولادیں کیا مرد اور کیا عورتیں عیاشوں، فاسقوں اور فاجروں کی صف میں شامل تھیں۔ یہی شخص حارث بن خالد کی گورنری کے زمانہ میں ایک دن عائشہ بنت طلحہ طواف میں مصروف تھی چونکہ یہ شخص اس سے خاص تعلق رکھتا تھا، جب اذان کا وقت ہوا عائشہ نے حارث کے پاس پیغام بھجوایا کہ کہدو کہ جب تک میرا طواف تمام نہ ہو اذان نہ دی جائے حارث نے حکم دیدیا کہ عصر کی اذان نہ دی جائے لوگوں نے اعتراض کیا کہ تم ایک شخص کے طواف کی خاطر چاہتے ہو کہ لوگوں کی نماز میں تاخیر ہوجائے؟ تو حارث جواب دیتا ہے: ''بخدا اگر کل صبح تک بھی اس کا طواف طول کھینچتا تو میں یہی کہتا کہ اذان نہ دی جائے۔''!!

سیاسی بدعنوانیاں:- اس فکری اور اخلاقی انحطاط کے ساتھ ہی ساتھ یہ دور سیاسی بدعنوانیوں سے بھی دوچار تھا اور اس کا بھی دینی احکام سے بے اعتنائی میں بڑا دخل تھا۔ زیادہ تر بڑی بڑی شخصیتیں اپنی مادی خواہشات کی تکمیل کے لئے حکومت کے سربرآوردہ افراد کی ڈیوڑھیوں پر سلامی دیا کرتی تھیں۔ محمد بن شہاب زہری جیسی بزرگ شخصیت جو ایک وقت امام سجادؑ کے شاگردوں میں داخل تھی اپنے آپ کو اس پستی میں گرا چکی تھی کہ امام چہارمؑ کو وہ مشہور و معروف خط لکھنا پڑا جو صرف ایک خط ہی نہیں بلکہ ان حقائق کی بھی نقاب کشائی کرتا ہے کہ اس نے کس قسم کے لوگوں سے ربط ضبط پیدا کر رکھا تھا اور محمد بن شہاب جیسے افراد کی کمی نہیں تھی۔

علامہ مجلسی رضوان اللہ علیہ نے جو بات ابن ابی الحدید سے نقل کی ہے اس کو پڑھ کر انسانی ذہن کو سخت جھٹکا لگتا ہے۔ بحارالانوار میں علامہ مجلسیؒ نے اولاً جناب جابرؓ کی زبانی امام سجادؑ کا ایک قول نقل کیا ہے امامؑ فرماتے ہیں: **ماندری کیف نضع بالناس، ان حدثنا هم بما سمعنا من رسول اللّٰه ضحكوا** (فقط یہ کہ حدیث رسولؐ کو قبول نہیں کرتے بلکہ ہنس کر مذاق اڑاتے ہیں) **وان سكتنالم يسعنا**

اس کے بعد علامہ ایک ماجرا نقل کرتے ہیں کہ حضرتؑ لوگوں کے درمیان حدیث نقل کر رہے ہیں کہ مجمع کے درمیان سے ایک شخص اٹھ کر مذاق اڑاتا ہے اور حدیث قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ واقعہ نقل کرنے کے بعد علامہ مجلسی زہری اور سعید ابن مسیب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ لوگ منحرفین میں سے تھے۔ (اگرچہ میں ذاتی طور پر سعید ابن مسیب کے سلسلہ میں یہ بات قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں کیوں کہ دوسری دلیلوں سے آپ کا امام علیہ السلام کے حواریین میں سے ہونا ثابت ہے البتہ زہری کے سلسلہ میں یہ بات صحیح ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دوسرے افراد پر یہ بات صادق آتی ہے) جیسا کہ اس کے بعد خود علامہ مجلسی لکھتے ہیں کہ: ''ابن ابی الحدید نے ایسی بہت سی شخصیتوں اور اس دور کے رجال (معزز ہستیوں) کا نام ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ سب اہلبیتؑ سے منحرف تھے اور پھر آپ حضرت سجادؑ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا: ''**مابمكة والمدينة عشرون رجلاً يحبوننا**'' پورے مکہ اور مدینہ میں ایسے بیس

آدمی بھی نہیں ہیں جو ہم کو دوست رکھتے ہوں۔

امام زین العابدین علیہ السلام ایسے بدترین حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے اور یہی وہ دور ہے جب آپ اپنے عظیم مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد شروع کرتے ہیں اور اسی زمانہ کی طرف امام جعفر صادق علیہ السلام ان لفظوں میں اشارہ فرماتے ہیں: ''ارتدّ الناس بعد الحسین الا ثلاثۃ ''امام حسینؑ کے بعد تین افراد کے علاوہ سبھی لوگ مرتد ہو گئے تھے۔ اور ان تینوں آدمیوں کا نام لیتے ہیں: ابوالخالد الکابلی، یحییٰ ابن ام الطویل اور جبیر بن مطعم (البتہ علامہ شوستری کا خیال ہے کہ جبیر بن مطعم کے بجائے حکیم ابن جبیر ابن مطعم ہونا چاہیے۔ بعض نقلوں میں محمد ابن جبیر ابن مطعم درج ہے۔ بحار کی ایک روایت میں چار افراد کے نام ملتے ہیں جبکہ بعض روایتوں میں پانچ اشخاص کے نام لئے گئے ہیں۔ پھر بھی یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ قابل جمع ہیں) اتنے سخت ماحول اور ایسی سنگلاخ وادی میں رہتے ہوئے امامؑ اپنے ہدف کی تکمیل کے لئے جدوجہد کا آغاز کرتے ہیں۔

ہر طرف ہے روشنی شبیرؑ سے

قائم مہدی نقوی تذہیبؔ نگروری

زندگی ہے دین کی شبیر سے خیر کی ہے روشنی شبیر سے
پاکے دولت عزم و استقلال کی کتنا ہے خوش ہے آدمی شبیر سے
موت سے گھبرا رہا تھا حر بہت زندگانی مانگ لی شبیر سے
عہد حیوانی کو مایوسی کے بیچ آدمیت مل گئی شبیر سے
آفتاب علم و حکمت بن گیا منبر پیغمبری شبیر سے
حر کو آزادی کا سورج کر دیا سیکھو! بندہ پروری شبیر سے
ہر بلندی دست بستہ ہے کھڑی مانگتی ہے زندگی شبیر سے
شادمانی میں توازن کے لئے غم کی دولت مل گئی شبیر سے
آج بھی دانشوران دہر کو ملتی ہے دیدہ وری شبیر سے
ہو رہی ہے پردۂ تحریک میں وقت کی صورت گری شبیر سے
دیکھئے حق و صداقت کا کمال ہر طرف ہے روشنی شبیر سے
نوع انساں کو حیات جاوداں مل رہی ہے آج بھی شبیر سے
کتنی مالامال ہے غم کے طفیل اپنی اردو شاعری شبیر سے
کیوں کرے تذہیبؔ اب جنت کی بات اس کو جنت مل گئی شبیر سے